R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۳-۶۵

[illegible]

جلد ۲۴ - شمارہ ۹ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | یکم مارچ ۱۹۶۵ء

اداریہ

لمبا راستہ ہی ٹھیک ہوتا ہے

دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر شر کے اندر ایک خیر کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ مدراس میں جو واقعات ہوئے ان کی وجہ سے ملک کا بڑا نقصان ہوا۔ چند آدمیوں نے اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ پچاس سے اوپر جانیں ہنگامے میں گئیں۔ ریلوے کا اور قومی سرمائے کا بہت نقصان ہوا جس کا تخمینہ کروڑوں تک پہنچتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ملک میں بھی سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ ملک میں اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھنا ہر حال میں ضروری ہے اور زبان کے مسئلے پر کوئی ایسا فیصلہ ہونا چاہیے جس میں سب کے لیے گنجائش ہو اور کسی لسانی علاقے کے رہنے والوں کو احساس کمتری نہ ہو۔ اگرچہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ ہندی کے نادان دوست مدراس کے ہنگامے سے چڑ گئے ہیں اور جنوبی ہند کے واقعات سے متاثر ہو کر سمجھوتے کی کوشش کو پسند نہیں کرتے، مگر عام طور پر ایسا نہیں ہے۔ اس لیے یہ امید بندھتی ہے کہ زبان کے مسئلے پر مرکز سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا ثبوت دے گا اور تمام علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے راہیں نکالے گا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ بالآخر ہندی کو انگریزی کی جگہ لینی ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس تبدیلی میں تیزی نہیں دکھانی چاہیے اور انگریزی کو اس وقت تک قانون کے ذریعے شریک زبان قرار دینا چاہیے جب تک جنوبی ہند اور بنگال کے لوگ چاہیں اور جب تک ہندی اس قابل نہ ہو جائے کہ جدید دور کی ساری ضروریات کو پورا کر سکے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاملہ صرف ملازمتوں کا ہے۔ ملازمتوں کے مسئلے کی اہمیت ضرور ہے، مگر دراصل یہ ذہنیت کا مسئلہ ہے۔ جنوبی ہند کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ہندی میں کاروبار ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت دوسرے درجے کی ہو جائے گی اور ہندی کے علاقے کے لوگوں کو فوقیت حاصل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ تمام علاقوں کو ساتھ لینے کے لیے ہندی کے علاقے کے لوگوں کو انتظار کرنا چاہیے۔ سب کو ساتھ لے کر چلنا اکیلے دوڑنے سے بہتر ہے۔ اس طرح رفتار سست ہو تو ہو مگر گرنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سرکاری زبان کے مسئلے کو علاقائی زبانوں کی ترقی کے مسئلے سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔ جتنی ہی علاقائی زبانوں کو ترقی ہوگی اتنی ہی ان کے متعلق ہم خیالی کی راہ نکلے گی۔ علاقائی زبانوں میں ایک اہم زبان اردو بھی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی ویسا علاقہ نہیں ہے جو ہندی کا بھی علاقہ نہ ہو، مگر غور سے دیکھا جائے تو ہندی کے علاقے میں اردو کا چلن ہندی سے زیادہ ہی ہے۔ دراصل کھڑی بولی برج، اودھی، راجستھانی، بھوجپوری کے علاقے میں جو ہندی کے علاقے سمجھے جاتے ہیں، دیہات میں یہ بولیاں رائج ہیں۔ شہروں کی زبان پر اردو کی گہری چھاپ ہے۔ کھڑی بولی کے دیہات کی بولی بھی اردو سے قریب ہے۔ اس طرح ہندی کی ترقی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ اردو کو گلے لگائے

اس شمارے میں

اس کی اہمیت کا اعتراف کرے۔ اس کے چلن کو دل میں جگہ دے۔ اردو سے بے نیاز ہوکر ہندی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس لیے اول تو اردو کو علاقائی زبانوں میں اس کا حق ملنا چاہیے اور دوسرے ہندی میں اس کا حصہ قرار واقعی ہونا چاہیے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وزیر اعظم کو اب اس مسئلے کی اہمیت کا احساس ہوا ہے اور انھوں نے اتردیش، بہار اور دہلی میں اردو کی پوزیشن کا اعتراف کیا ہے، مگر یہ اعتراف کافی نہیں ہے۔ اسے قانونی شکل ملنی چاہیے۔ ہمارے خیال میں سب سے اچھی صورت ایک ہی ہے۔ اتر پردیش، بہار، پنجاب اور دہلی میں اردو کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ دفعہ ۳۴۷ کی رو سے دستور میں اس کی گنجائش ہے۔ اس طرح اردو کی ترقی کے مواقع نکل آئیں گے ہندی کو بھی مدد ملے گی اور جو آسان ہندی بنے گی وہ جنوبی ہند والوں کے لیے بھی قابل قبول ہوگی۔ دیکھنا ہے کہ ہماری حکومت اس سلسلے میں مناسب قدم کب اٹھاتی ہے۔

سربین

ہم نے کچھ عرصہ ہوا اس کالم میں لکھا تھا کہ مشاعروں میں شعرا کو اپنا کلام سنانا چاہیے دوسروں کا نہیں۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ دلیپ کمار جیسے مشہور اداکار کا غیر کا کلام مشاعرے میں سنانا ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ یہ پروگرام شام غزل کا ہے جس میں مشہور شعرا کی غزلیں ترنم سے سنانی چاہییں۔ ہمارے نوٹ سے یہ کسی طرح مترشح نہیں ہوتا تھا کہ ہم فلم کے یا ترنم کے خلاف ہیں۔ لیکن حال ہی میں انقلاب بمبئی میں جناب آغا جانی کشمیری نے اس سلسلے میں جو مضمون لکھا ہے اسے پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آج کل منطق کو کوئی نہیں دیکھتا، نہ زیر بحث مسئلے پر رائے دیتا ہے، غیر متعلق مسائل چھیڑ دیتا ہے تاکہ لوگ مشتعل ہو جائیں۔

ہم فلم کے ہرگز خلاف نہیں۔ ہم اسے فن کی ایک صنف سمجھتے ہیں۔ ان اداکاروں کے لیے جنھوں نے فلم کے ذریعہ فن کی خدمت کی ہے، ہمارے دل میں بڑا احترام ہے۔ دلیپ کمار قدر اول کے فن کار ہیں۔ اس لیے ہم ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مشاعرے میں دلیپ کمار کا غیر کی غزل سنانا بھی جائز ہے۔ اس کے لیے شام غزل کا پروگرام زیادہ موزوں ہے۔ مشاعرہ نہیں۔ اسی طرح ہم ترنم کے خلاف نہیں۔ ترنم کسے برا لگتا ہے۔ ہاں ترنم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے شاعری کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے اسے ہم اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ترنم سے پڑھنے کے مقابلے میں تحت اللفظ پڑھنے سے شعر کی اصلی خوبیاں زیادہ واضح ہوتی ہیں۔ پھر بھی مشاعروں میں اگر کوئی ترنم سے غزل سناتا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں اگر صرف ایسے لوگوں کو بزم سخن میں رونق کے لیے بلایا جائے جن کے پاس ترنم ہی ترنم ہے، شاعری کی جگہ اللہ کا نام ہے، تو ہمیں یہ روش پسند نہیں یہ شاعری کی خدمت نہیں اس کے ساتھ زیادتی ہے۔

اب بتائیے اس سے یہ پہلو کیسے نکلا کہ ہماری زبان انجمن ترقی اردو کا نہیں، انجمن تنزل اردو کا آلۂ کار ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور کہنی ہے۔ علمی و ادبی مسائل میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ اس پر کسی کو برافروختہ نہیں ہونا چاہیے۔ فلم والوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ اس اعتراف کے بہت سے طریقے ہیں۔ جگر صاحب کی جو مدد فلمی حلقوں سے کی گئی اس کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ جن لوگوں نے جگر صاحب کی خدمت کی وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں فن اور فن کاروں کی خدمت کا جذبہ صرف علمی دنیا تک محدود نہیں۔ اتفاق سے فلم کی کاروباری دنیا میں ایسی بھی شخصیتیں ہیں جو علم و ادب کی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں یہی شخصیتیں اچھے شعرا کی مدد کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فلمی شخصیتوں سے مشاعرے کی رونق کا کام لینا، ادب کی خدمت ہے ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ فلم کی قدر کرنا اور فلمی دنیا کی مشہور شخصیتوں کی قدر کرنا اور ہے اور ان کی مقبولیت سے مشاعروں میں کام لینا دوسری بات ہے۔ اس دوسری بات پر ہم نے اعتراض کیا تھا۔

"من سمجھاون"

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مرتب کردہ اس کتاب کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد نے شایع کیا ہے۔ اس کی قیمت آٹھ روپے ہے۔

"شوخیٔ لب"

مکتبہ شعرستان رام پور اس نام سے ایک شعری مجموعہ عنقریب شایع کر رہا ہے جسے قیس رام پوری نے مرتب کیا ہے۔

سید نفیس الدین

داغ کے شاگرد شرف گلشن آبادی

گلشن آباد (جاورہ) ایک مسلم ریاست (جاورہ اسٹیٹ) کا پایۂ تخت رہا ہے۔ عام مذاق کے مطابق، دیگر ریاستوں کی طرح، یہاں بھی شعر و سخن کی مجالس آراستہ ہوتی تھیں اور یہاں کے رئیس بھی [illegible] اپنے وابستگان شعراء کی قدر افزائی کیا کرتے تھے اسی ریاست کے ایک قابل قدر شاعر و شاگرد داغؔ[1] جناب صاحبزادہ میرزا اشرف یار خاں صاحب شرفؔ[2]، فرزند حضور نواب صاحب بہادر والی جاورہ[3] گذرے ہیں۔

حالات — ان سے متعلق مولانا خواجہ [illegible] اجمیری[4] تذکرۂ شعرائے اجمیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

[illegible] کے خاندان سے تھے۔ جاورہ ریاست میں پیدا ہوئے استاد داغؔ سے شرف تلمذ تھا۔ اجمیر شریف میں اکثر و بیشتر قیام رہا اور بہت سے مقامی مشاعروں میں شرکت فرمائی غالباً [illegible] میں تقریباً [illegible] برس کی عمر میں جاورہ میں انتقال کیا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

نمونۂ کلام

تیر نگاہ دل پہ [illegible] پڑ کے رہ گیا | ایسا [illegible] نظر میں اڑ [illegible] کے رہ گیا
جھگڑا ملاپ ہوتے ہی بڑھ کے رہ گیا | [illegible] بار اڑ کے رہ گیا
آئینہ ان سے چھوٹ [illegible] کے رہ گیا | دونوں میں جس کا [illegible] پڑ کے رہ گیا
[illegible] گلشن کے بعد [illegible] | [illegible] مراد [illegible] کے رہ گیا
روز وصال جان نزاکت نے [illegible] | میرے گلے میں ہاتھ [illegible] پڑ کے رہ گیا

مٹتے مٹتے خاک اڑائی جائے گی | خاک اڑ کر [illegible] جائے گی
آہ اب دل سے نکالی جائے گی | تم [illegible] خالی جائے گی
کیا [illegible] جائے گی | [illegible] جائے گی
عشق کی افتاد سے ڈرتے نہیں | جو پڑے گی وہ اٹھائی جائے گی
آئینے کے سامنے بیٹھے ہو تم | آپ اپنی چوٹ کھائی جائے گی

۱؎ پیام یار بابت اکتوبر ۱۸۸۸ء، نومبر ۱۸۸۸ء، دسمبر ۱۸۸۸ء، اگست ۱۸۸۹ء

۲؎ پیام یار بابت اپریل، اکتوبر، نومبر، دسمبر [illegible]، اگست، اکتوبر [illegible]، جنوری [illegible]

۳؎ تذکرۂ شعرائے اجمیر میں شرف کو [illegible] لکھا گیا ہے [illegible] (شرف گلشن آبادی)

۴؎ پیام یار بابت جنوری ۱۸۸۹ء

۵؎ اس غیر مرتب تذکرہ کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دے رہا ہوں۔

صورت زیبا نہیں چوری کا مال | ہم بھی دیکھیں گے چھپائی جائے گی
کھینچ کر تیغ ادا مجھ سے کہا | جان یوں تیری نکالی جائے گی
عید قرباں ہے نیا ہوگا سنگار | پھر ادا خنجر [illegible] جائے گی
تم گلے مل [illegible] | [illegible] نکالی جائے گی
دل خدا کا گھر [illegible] | [illegible] دیوار اٹھائی جائے گی
اے شرف جب ہاتھ سے جاتی رہی | پھر طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

دل حسینوں سے کیا لگاتے ہیں | جان کر جان پر بناتے ہیں
[illegible] بیٹھا ہوا دامن | بات بگڑی ہوئی بناتے ہیں
غیر سے [illegible] انگڑائی | سینے کے زور سے دباتے ہیں
نہیں اٹھتے فراق کے صدمے | نہیں اٹھتے مگر اٹھاتے ہیں
[illegible] بہت گھبرائیں گے | ہاتھ آہستہ سے چھڑاتے ہیں
اے شرف آج کل بقول داغؔ | خیر خواب کی مناتے ہیں

یہ بھی ہے اک ادا [illegible] | ہم تجھ کو [illegible] آزما لے
دل [illegible] | [illegible] کون [illegible]
دل اور وہ [illegible] رشک [illegible] | [illegible] اللہ تو اٹھا لے
[illegible] کتنا بڑا [illegible] | کہتے ہیں ان کو [illegible]
اے تیغ ناز جاناں بسمل تڑپ [illegible] | ظالم [illegible]
تصویر کوئی کھینچے اس بزم [illegible] | بیٹھا ہے کس ادا سے [illegible]

بہت کچھ [illegible] کہتے ہیں خدا [illegible] | [illegible]
محبت میں [illegible] کا مزہ [illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
شرف [illegible] | [illegible]

دل بھی ہے دل میں ترے وصل کا ارمان بھی ہے
تجھ پہ مر جائے اتنی تو ابھی جان بھی ہے
[illegible] زیب نہیں تجھ پہ [illegible]
[illegible] آن بھی ہے شان بھی ہے

انتخاب کلام — [illegible] لکھنؤ کے مشہور گلدستہ [illegible] پیام یار کے بعض پرچوں میں آپ کا [illegible] انتخاب کلام [illegible] ہے۔

ان کو منظور [illegible] | ہم نہیں [illegible]
[illegible] | [illegible]

(صفحہ [illegible]، اپریل ۱۸۸۹ء)

ہوش آیا تو حشر کے دن بھی — ڈھونڈتے ہیں گے تمہیں کہیں نہ کہیں
مطلب وصل صاف کہنے سے — ڈر ہے روٹھ جائے کوئی حسیں نہ کہیں
درد دل میرا جانتا ہے وہی — جو کہ ہے مبتلا کہیں نہ کہیں
آج مجھ سے ملے تو یوں بولے — تم کو دیکھا تو ہے کہیں نہ کہیں
بہکی بہکی جو باتیں کرتے ہو — پھنس گئے ہو شرف کہیں نہ کہیں

(صفحہ ۸۔ اکتوبر ۱۸۸۶ء)

سن کے قصہ وصل کی شب مرے دلدار کا — مجھے نیند آنے لگی کیا خوب افسانہ ہے
باز آئے بلبل نالاں خدا کے واسطے — منہ کو آتا ہے کلیجہ [illegible] افسانہ ہے
اے شرف اللہ ہی قائم رکھے ایماں کو — کعبہ آ جاتے ہیں لیکن رہ میں بتخانہ ہے

(صفحہ ۵۔ نومبر ۱۸۸۶ء)

دم آخر عیادت کے لیے آئے — مرے جینے سے تم کو فائدہ کیا
ستائے جاں نہیں چھ سات برس بھی — خدا منصف نہیں روز جزا کیا

(صفحہ ۱۹۔ نومبر ۱۸۸۶ء)

محفل میں اپنی اس نے بٹھا کر اٹھا دیا — جتنا بڑھایا مجھے اتنا گھٹا دیا
معشوق ہی نہیں ہمیں کچھ بے وفا دیا — دل بھی دیا خدا نے تو نا آشنا دیا
کیا جانے یاد آ گیا اس بے خبر کو کیا — تربت جو میری دیکھ کے وہ مسکرا دیا
پہچان جان نہیں ہے جو میرا دل لیا — اچھا تو پھر عدو کو بتا کر یہ کیا دیا
مرقد میں ہم نے مر کے نکیرین کا سوال — بندے تھے تیرے سن کے اس کو سنا دیا

(صفحہ ۱۷۔ دسمبر ۱۸۸۶ء)

کیا کہوں میں کون ہوں تیرے ہی بیماروں میں ہوں
زلف کا قیدی ہوں گیسو کے گرفتاروں میں ہوں
حشر میں فریاد کیا کیجے، نہیں کوئی گواہ
دل بھی کہتا ہے میں اس بت کے طرفداروں میں ہوں
یہ نہیں معلوم کس کے عشق میں ہوں بے خبر
یہ نہیں مجھ کو خبر کس کے طلبگاروں میں ہوں
شام فرقت اپنا بیگانہ نہیں کوئی شریک
غم بھی کہتا ہے کہ میں کیوں تیرے غم خواروں میں ہوں
اس کی قسمت کے تو آگے کچھ نہیں ورنہ شرف
خوب میں سمجھا ہوا ہوں جن گنہگاروں میں ہوں

(صفحہ ۲۰۔ اگست ۱۸۸۸ء)

ترقی اس قدر ہے حسرت و غم ہائے پنہاں کو
کہ دوبھر ہو گیا ہے دل میں رہنا میرے ارماں کو
خدا جانے ارادہ آج کیا ہے میرے قاتل کا
کبھی مجھ کو کبھی وہ دیکھتا ہے تیغ براں کو
حسینان جہاں کو لا کے بٹھلایا ہے تصور میں
پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو
جہاں میں بیٹھتا ہوں وہ سرکتا ہے اڑ جائے
ستم کا ہے تنفر سایۂ دیوار جاناں کو

کلیجا جل گیا، دل بھن گیا ضبط محبت سے
الٰہی آگ لگ جائے مرے اس سوز پنہاں کو
لگا ہے اے شرف دھبہ جو میرے خون ناحق کا
چھپائے پھرتے ہیں وہ روز محشر اپنے داماں کو

(صفحات ۱۱، ۱۲۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء)

چلا کرتی ہے تیغ ظلم یار آہستہ آہستہ
کراہا کرتے ہیں سینہ فگار آہستہ آہستہ
پس مردن بھی میری ضعف میں وضعداری ہے
کہ اٹھتا ہے مرا مشت غبار آہستہ آہستہ
کہاں لیتے ہیں یہ تسبیح والے نام خالق کا
کیا کرتے ہیں حوروں کا شمار آہستہ آہستہ
اثر آتا تو آئے نالۂ پر درد میں میرے
وہ کہہ اٹھیں کہ میرے بیقرار آہستہ آہستہ
خیال تیر مژگاں ان سے بھی بڑھ کر ہے شوخی میں
کھٹکتا ہے یہ دل میں مثل خار آہستہ آہستہ
اٹھا کر پائنچے چلتے ہیں اور پھر یہ قیامت ہے
دبا جاتا ہے سینہ کو ابھار آہستہ آہستہ
وہ آمادہ ہوئے جب وصل کی شب ہاتھا پائی پر
نزاکت نے کہا اے گلعذار آہستہ آہستہ

(صفحات ۶، ۷۔ جنوری ۱۸۸۹ء)

بتوں کی محبت میں دنیا گئی
ارے کیسی دنیا کہ عقبیٰ گئی
شب وصل کی صبح یاد آ گئی
اداسی سر شام سے چھا گئی
مجھے کوستے تھے وہ صبح وصال
جو آنکھیں ملیں تو ہنسی آ گئی
عدم سے مرے ساتھ آئی تھی جاں
مگر بے وفا تھی کہ تنہا گئی
وہ عریانی سے سخت جانی سے میں
ادھر میں ادھر تیغ شرما گئی
مجھے اپنے مرنے کا کچھ غم نہیں
کلائی میں قاتل کی موچ آ گئی
کسی بوالہوس کی طبیعت تھی کیا
شب وصل کیا آئی اور کیا گئی
یہ دن یہ خوشی کب تھی اے دل مجھے
مگر آرزو کوئی بر آ گئی
خدائی جدائی تو سہہ لی شرف
بتوں کی جدائی مگر کھا گئی

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

غزلیں

چندر پرکاش شاد

ماند پڑنے لگے سلسلے — اب تو کوئی مجھے آ ملے
تیرے دل میں مری یاد ہو — سینۂ سنگ پر گل کھلے!
تو بچھڑ جائے دنیا مجھے — تو جو مل جائے دنیا ملے
کوئی منزل نہیں شوق کی — بے کراں ہیں یہ سب سلسلے
پھر بھٹکنے لگیں منزلیں — پھر بکھرنے لگے قافلے
تم مرے سامنے ہو مگر — درمیاں ہیں کئی فاصلے
دن تو کانٹا تھا احساس کا — رات کا پھول شاید کھلے
یوں وہ چھو لے مری بات پر — جیسے پھولوں کی ڈالی ہلے
ایک گم گشتہ آواز پر — بڑھتے جاتے ہیں سب قافلے

کمال الدین کمال

بشر نے متاعِ حیا بیچ ڈالی — خودی کی مقدس قبا بیچ ڈالی
سفاہت کو تہذیب کا نام دے کر — شرافت کی ہر اک ادا بیچ ڈالی
مروت محبت دیانت صداقت — وہ ہر شے کہ تھی بے بہا بیچ ڈالی
جفا کار، بے آدمی، آدمی نے — غضب ہے کہ جنسِ وفا بیچ ڈالی
رضائے بشر جس جگہ ہاتھ آئی — وہیں پر رضائے خدا بیچ ڈالی
کمال آج کل کا وہ انسان ہے جس نے — کہ انسانیت برملا بیچ ڈالی

شمسی طہرانی

محبت بے نیازِ کفر و دیں ہے — محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے
حضورِ دوست سجدے میں جبیں ہے — تصور میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
مزاجِ حسن کی ہو خیر یارب — صبا میں بوئے زلفِ عنبریں ہے
برائے جہدِ مسلسل آدمی کو — مقامِ زندگی حاصل نہیں ہے
محبت پر نہ کر تنقید ناصح — محبت حاصلِ دنیا و دیں ہے
جہاں تو ہے وہاں سب کچھ ہے اے دوست! — جہاں میں ہوں وہاں تو بھی نہیں ہے
غمِ جاناں غمِ جاناں ہے یارو! — غمِ دوراں بھی لیکن کم نہیں ہے
خراماں ہے کوئی مہ زادۂ شب — ستاروں کی نظر سوئے زمیں ہے
نہیں میں جنتِ آدم کا قائل — جہاں تم ہو مری جنت وہیں ہے
نہ ہو جس دل میں دردِ عشق پنہاں — وہ کوئی اور شے ہے دل نہیں ہے
بہاریں ڈھونڈتی پھرتی ہیں جس کو — وہ شمسی آج کل صحرا نشیں ہے

ثریا محمود ندرت

ایسے بھی لمحے زیست میں سو بار آئے ہیں — جب چشمِ انتظار نے آنسو بہائے ہیں
دل کو شکایتِ غمِ جاناں نہیں کہ ہم — آلامِ زندگی پہ سدا مسکرائے ہیں
گرچہ کڑی ہے دھوپ مگر پھر بھی ہمسفر! — راہِ وفا میں آج بھی سائے ہی سائے ہیں
کچھ دن بھی ہم کو راس آئی کوئی خوشی — کچھ خود بھی دل نے حوصلے غم کے بڑھائے ہیں
ندرت ہمارے عزم کی پائندگی کی داد — ہر تازہ واردات پہ ہم مسکرائے ہیں

پٹیالہ میں بھی خواہانِ اردو کا ایک اور اجتماع

موسمِ بہار کے ساتھ ساتھ گلشنِ ادب بھی کھل اٹھا اور زبانِ اردو پر بھی بہار آنے لگی۔

پٹیالہ ۸ رفروری ۱۹۶۵ء۔ گزشتہ شب پروفیسر کرپال سنگھ صاحب بیدار کے ایما پر ایک غیر معمولی ادبی نشست زیرِ صدارت لسان العصر جناب اودے سنگھ صاحب شائق بتقریب موسمِ بہار جناب نوبہار صاحب صابر کی جائے رہائش پر منعقد ہوئی جس میں مقامی شعراء کے علاوہ جناب کندن گرگانوی اہلِ ذوق اور معززینِ شہر جن میں خواتین بھی شامل تھیں نے بھرپور حصہ لے کر اردو سے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مقامی شعراء کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں۔

جناب اودے سنگھ صاحب شائق۔ پروفیسر کرپال سنگھ بیدار۔ جناب نوبہار صابر۔ جناب طالب شگوری۔ جناب ساغر شفائی۔ جناب جگر جالندھری۔ جناب مہیش پٹیالوی۔ جناب نازاں۔ جناب جوہر۔ جناب راج دیوانہ۔ جناب پریم حسرت۔ جناب راز اور جناب شباب۔ مشاعرہ ۶ بجے سے لے کر دس بجے شب پوری کامیابی سے ختم ہوا۔ بزم آخری دم تک جمی رہی کسی صاحب نے اٹھ کر جانے کی زحمت نہیں فرمائی حاضرین نے اردو سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔

(مہیش پٹیالوی)

مراسلہ نگار مراسلہ لکھتے وقت صفحہ کے ایک طرف لکھا کریں اور خوش خط لکھیں مقام کا نام اور دستخط بھی صاف ہوں (ادارہ)

ناوم سیتاپوری

ادھوری یادداشتیں

شیخ عبدالرحیم سہ سدّی

برادرم مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی نے سادہ کاغذ کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا ہے۔ کاغذ اسی ضلع سیتاپور کی قدیم صنعت کاغذ سازی کا ایک تاریخی نمونہ ہے۔ پرانے زمانے میں اودھ میں عام طور سے یہی کاغذ استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کاغذ پر لکھی ہوئی کچھ کتابیں بھی میری نظر سے گزری ہیں۔

خیرآباد (ضلع سیتاپور) سے کوئی ڈیڑھ دو میل جانب جنوب ایک پٹھانوں کا مشہور گاؤں ہے "رحیم آباد کاغذی" جہاں پرانے قلعہ کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ اس گاؤں کو "عہد شاہجہانی" میں شیخ عبدالرحیم نے آباد کیا تھا جنھیں شہنشاہ ہند نے "سہ سدّی" کا خطاب دیگر جاگیر بھی عطا فرمائی تھی۔ شاہی فرامین اب تک اس خاندان میں بطور تبرک محفوظ ہیں۔ اسی خاندان نے اودھ میں صنعت کاغذ سازی کو رواج دیا اور جس طرح "ایلدور" کے قدیم کاغذ ساز "خاندان آج بھی "کاغذی" مشہور ہیں اسی طرح یہ گاؤں بھی "رحیم آباد کاغذی" مشہور ہو گیا۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے "خیرآباد" بھی اپنی علمی فضیلت اور ثقافتی چہل پہل کے اعتبار سے ایک خاص شہرت رکھتا تھا بڑے بڑے علماء، فضلاء، حکماء، فقہا اور مشائخ اور رنگ آرائے "مدینۃ الاولیا" تھے اور شیخ عبدالرحیم سہ سدّی کا زیادہ تر وقت انھیں علمی مجلسوں میں گذرا۔ مخدوم سید عیسیٰ خیرآبادی سے ان کی علمی نوک جھونک بھی رہتی اور عالمانہ مناظرے بھی۔ چنانچہ مخدوم صاحب نے انھیں "شیخ عبدالرحیم سہ سدّی" کے بارے میں کہا ہے:

شیخ عبدالرحیم سہ سدّی
خانہ ساخت بر لب ندی
دور افتاد از خدا و نبی
بجز از جلد کاغذ ردّی

* موضع رحیم آباد کاغذی جس جگہ پر آباد ہے وہاں ایک چھوٹا سا دریا بھی موجود ہے۔

کلام میر میں اختلاف نسخ

کلیات میر کا ایک قلمی نسخہ محب محترم نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کتب خانے میں محفوظ ہے جس میں بعض اشعار کچھ اس سے مختلف طور پر درج ہیں جس طرح مروجہ دیوان میں شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً حسب ذیل اشعار۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

نواب صاحب کا بیان ہے کہ یہ مطلع اور مقطع اس قلمی نسخے میں اس طور پر لکھا ہوا ہے۔

"راہ دور عشق" میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

تذکرہ قلمی نسخہ اس وقت تلاش سے دستیاب نہ ہو سکا ورنہ شاید اختلاف نسخے کی کچھ اور مثالیں سامنے آجاتیں۔

(۲۳/۸/۹۳ء لکھنؤ)

نسیم دہلوی اور مرزا غالب

نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی (تلمیذ مومن دہلوی) جو کسی زمانے میں دلّی سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۲ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ منشی امیر اللہ تسلیم انھیں کے شاگرد تھے اور حسرت موہانی کو تسلیم سے افتخار تلمذ تھا۔ اسی نسبت سے انھوں نے اپنے "استاد الاساتذہ" (نسیم دہلوی) کا حال جو تذکرہ وہ جو کے "اردوئے معلیٰ" میں تحریر فرمایا ہے جو "انتخاب اردوئے معلیٰ" (مطبوعہ اردو پریس علی گڑھ) حصہ اوّل میں بھی شامل ہے حسرت لکھتے ہیں۔

"کسی گلدستہ میں نسیم کی ایک غزل دیکھ کر مرزا غالب نے منشی نولکشور سے ان کا حال دریافت کیا اور ان کی چند دیگر غزلوں کا شوق ظاہر کیا! منشی صاحب نے ان سے بدقت تمام سب حال پوچھ کر لکھا اور غزلیں بھی بھیجیں۔ غالب نے جواب میں اپنی کمال پسندیدگی کا اظہار کیا اور ان کا دہلوی ہونا معلوم کر کے لکھا کہ۔

"گہر باجستم د عقیق یافتم"

(صفحہ ۵۔ انتخاب اردوئے معلیٰ)

غالب کا ایک ادھورا خط۔؟

اب سے بیس برس قبل لکھی ہوئی ایک

نوٹ بک میں ایک ادھوری یادداشت نظر آئی۔ یہ یادداشت میں نے جس کتاب سے نقل کی تھی اس کے صفحات نمبر ۳۴۴ و ۳۴۶ بھی نوٹ کیے۔ لیکن نہ جانے کیوں اصل ماخذ کا حوالہ رہ گیا اب لاکھ لاکھ غور کرتا ہوں کچھ یاد نہیں آتا کہ یہ عبارت کہاں سے نقل کی ہے۔ اپنی لکھی ہوئی پوری عبارت ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔

"مرزا غالب کا ایک غیر معروف خط"

"دسمبر ۱۸۵۵ء میں ایک خط محررہ راقم مولوی محمد عزیزالدین صاحب نے مرزا غالب کو دلی کا حال دریافت کرنے کی غرض سے لکھا تھا۔ اس کا جواب مرزا نوشہ غالب نے ان کو لکھا تھا اگرچہ وہ اصل خط دستیاب نہیں ہوا لیکن اس کے چند فقرے ہم اپنی یاد سے لکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ:

"اے صاحب۔ کیسے صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسی ہی آباد سمجھتے ہو؟ تمہارے دیوان خانے میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی وہ وہیں ہے --- میاں کالے صاحب کے مکان میں اسپتال ہے۔ شہر میں ہندو ہی ہندو نظر آتے ہیں مسلمان خال خال ہیں انھیں میں میں ایک روسیاہ ہوں۔ "گھسی حلوائی" کی دوکان میں گدھے لوٹتے ہیں۔"

اور بھی فقرے ایسے ہی تھے جواب راقم کو یاد نہیں رہے۔ بیگم سے مراد دلی بیگم صاحبہ ہیں جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ گھسی حلوائی ہمارے دیوان خانے کے متعلق جو دکانات ہیں ان میں بیٹھا کرتا تھا اور اس کی مٹھائی شہر میں مشہور تھی۔"

(صفحہ ۳۴۴ - ۳۴۵)

۱۹۴۴ء میں جب یہ یادداشت لکھی تھی میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ہو سکتا ہے یہ نامکمل عبارت وہیں کے کسی کتب خانے سے نقل کی ہو۔!

ڈاکٹر اقبال کی ریڈریں

ڈاکٹر اقبال کی تصانیف میں اردو ریڈر کے تذکرے سے اب تک کان ناآشنا ہی تھے۔ لاہور کی چھپی ہوئی ایک پرانی ڈائری (دست ریکٹ ڈائری ۱۹۰۳ء) کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک اشتہار نظر پڑا۔ جو درج ذیل ہے

طلبا پرائمری کے لیے

"اردو ریڈرز"

مصنفہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب

و

فطرت نگار سدرشن

کتب کی خوبیوں کے لیے مصنفین کے نام ہی سب سے بڑی شہادت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب (اقبال) کی قابلیت اور سدرشن صاحب کی خوش بیانی نے کتب میں وہ خوبی بھر دی ہے جو دوسرے کسی سلسلہ میں نہیں ملتی۔ مضامین اخلاقی، تاریخی، تمدنی، زراعتی، صنعتی اور دیگر معلومات کے متعلق درج ہیں عبارت سلیس اور طرز تحریر نہایت سادہ ہے۔ کتاب کو پڑھتے جاتے آپ کو یہ معلوم ہوگا گویا آپ سرسری کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ قابل شعرا کی نظمیں جو بچوں کے مذاق اور معیار کے مطابق ہیں بہت سی دی گئی ہیں بہت ساری سہ رنگی اور ایک رنگی تصاویر کتب کی خوب صورتی بڑھانے کے علاوہ چھوٹے بچوں کو سبق پڑھانے میں بڑی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

کتاب خانہ کپور بند سنز لاہور

یہ چھوٹا سا اشتہار جس کی زبان بالکل کاروباری ہے اور اس سے ڈاکٹر اقبال کی عالمانہ فضیلت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی پھر بھی اگر اس قسم کی ریڈریں چھپی تھیں تو انھیں "اقبالیات" سے دور نہ سمجھنا چاہیے۔

راجستھان میں اردو کی شنوائی

انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ راجستھان اپنے یوم قیام یعنی آخر مارچ ۱۹۵۰ء سے راجستھان میں مسائل اردو کے لیے حکومت راجستھان سے مسلسل خط و کتابت کر رہی تھی۔ اور اپنے جائز مطالبات پیش کرتی رہی۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً تقریباً سب ہی مطالبے حکومت نے منظور کر کے احکام جاری کر دیے تھے۔ مثلاً جب پرائمری اسکول کے کسی ایک کلاس میں دس یا پورے اسکول میں چالیس طلبہ ایسے ہوں جن کی مادری زبان اردو ہو تو ان کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہو اور جملہ مضامین بھی ان کو اردو ہی میں پڑھائے جائیں۔ البتہ اس خیال سے کہ بچہ ہندی میں کمزور نہ رہ جائے، تیسرے درجے سے ہندی بھی دصرف زبان) شروع کر دی جائے۔ اور اوپر کے کلاسوں میں بھی بحیثیت اختیاری مضمون، یا تیسری ہندوستانی زبان کے طور پر اردو بھی پڑھائی جائے۔ اسی طرح اردو کی درخواستوں کا جملہ محکمات و دفاتر میں قبول کیا جانا۔ اردو کی دستاویزات کی نقول اردو ہی میں دیا جانا۔ سرکاری اعلانات و اشتہارات اور قوانین و قواعد کا اردو میں بھی شائع کیا جانا۔ پبلک لائبریریوں اور مدرسوں کی لائبریریوں میں اردو کی کتابوں کا خریدا جانا۔ طب یونانی کے نسخوں کا اردو میں لکھے جانے کی اجازت ہونا۔ ابتدائی درجوں کے لیے اردو کی درسی کتابیں طبع کیا جانا۔ وغیرہ۔ مگر ان احکام کی تعمیل درمیانی اور ادنیٰ درجہ کے ملازمان نہیں کر رہے تھے اور اب بھی باوجود کوشش پورے طور پر تعمیل نہیں ہو رہی ہے بلکہ رکاوٹیں اور دقتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ انجمن راجستھان، حکومت کو اس طرف برابر توجہ دلاتی رہی اور شکایات پیش کرتی رہی۔ حتیٰ کہ کل ہند اردو کانفرنس جے پور منعقدہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ایک ریزولیوشن بھی پیش کر کے استدعا کی گئی کہ حکومت راجستھان دو کمیٹیاں اس غرض سے بنائے کہ شکایات رفع ہوں اور تعمیل احکام واقعی طور پر ہوتی رہے۔ چنانچہ کانفرنس نے یہ ریزولیوشن منظور کیا۔ جو ہماری زبان مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انجمن راجستھان نے اسی بنا پر حکومت راجستھان سے خط و کتابت کی کہ وہ حسب ذیل دو کمیٹیاں جلد تشکیل کرے۔

(۱) اعلیٰ اختیارات والی کمیٹی جس کے صدر خود چیف منسٹر راجستھان ہوں۔ اور ممبر متعلقہ وزرا اور سکریٹریز نیز اردو سے تعلق رکھنے والے اصحاب

(۲) عدم تعمیل احکام کی وجہ معلوم کرنے والی اور شکایات کی تحقیقات کر کے کمیٹی (۱) کو رائے دینے والی نیز جاری شدہ احکام کی تعمیل کرانے کے لیے بااختیار کمیٹی اس میں بھی سرکاری اعلیٰ عہدیداران کے علاوہ انجمن راجستھان کے ایک یا دو ارکان بطور نمائندہ اردو ممبر ہوں۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۶۳ء میں بھی بموقع افتتاح "اردو ہیپوزیم جے پور" چیف منسٹر صاحب راجستھان نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ بات حکومت کے نوٹس میں آ چکی ہے کہ اوسط و ادنیٰ درجہ کے ملازمان، اردو کے متعلق احکام کی تعمیل نہیں کر رہے ہیں، جو بالضرور کرائی جائے گی۔ اور پھر کل ہند اردو کانفرنس جے پور کا افتتاح کرتے وقت بھی اعلان کیا تھا کہ ان شکایات کو دور کرنے اور تعمیل احکام کرانے کے لیے، حکومت ایک کمیٹی بنائے گی اور شکایات دور کی جائیں گی۔ انجمن راجستھان اس کی یاد دہانی کرتی رہی چنانچہ بذریعہ ... سے معلوم ہوا ہے کہ بحکم گورنر صاحب راجستھان بماہ دسمبر ۱۹۶۴ء ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے، جو احکام جاری شدہ کی تعمیل کرائے گی اور شکایات دور کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

اس کمیٹی کے چیرمین، چیف سکریٹری صاحب راجستھان ہیں اور ممبران:

(۱) ایجوکیشن سکریٹری صاحب راجستھان

(۲) لا سکریٹری صاحب راجستھان

(۳) خان بہادر نظامت احمد صاحب خیری، انیسرآن اسپیشل ڈیوٹی ریونیو ڈپارٹمنٹ راجستھان واضح رہے کہ آپ انجمن ترقی اردو راجستھان کے صدر بھی ہیں۔

(۴) ہز ہائی نس نواب صاحب لوہارو۔

(۵) سید عابد علی صاحب ایڈوکیٹ۔ صدر وقف بورڈ راجستھان اور ممبر سکریٹری، اسپیشل سکریٹری صاحب اپوائنٹمنٹ ڈپارٹمنٹ راجستھان۔ یہ کمیٹی سال میں دو بار میٹنگ کر کے اردو کے مسائل کا حل تجویز کرے گی اور تعمیل احکام کرائے گی۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ کمیٹی اپنے مقصد میں کامیاب اور مفید ثابت ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ حکومت راجستھان کے جاری کردہ احکام کی اگر واقعی تعمیل ہونے لگے کہ جس کی اب پوری امید ہے تو جہاں تک راجستھان میں اردو کے مسائل کا تعلق ہے، وہ سب حل ہو کر شکایات ختم ہو جائیں گی۔

(احتشام الدین احمد شاکر جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور)

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

شرفت ہاتھ آئے ہیں مدت میں وہ
خدا کے لیے اب نہ کرنا گئی
(صفحات ۱۲، ۱۳، اگست ۱۸۸۵ء)

"پیام یار" دسمبر ۱۸۸۶ء سے ان کے ایک شاگرد کا بھی پتہ چلتا ہے جن کا مندرجہ ذیل انتخاب کلام اس پرچہ میں شائع ہوا ہے۔

"جناب میر احسان علی صاحب حزیں شاگرد جناب شرفت گلشن آبادی:

غیروں کے آگے یار نے مجھ کو دکھا کے آنکھ
محفل میں پتلیوں کا تماشا دکھا دیا
صحرا کی خاک چھانی گلستاں کی سیر کی
فرقت نے تیری سارا زمانہ دکھا دیا
(ص ۲۷، دسمبر ۱۸۸۶ء)

نوٹ۔ مجھے زیر ترتیب "تذکرہ شعرائے اجمیر" کے لیے شرفت گلشن آبادی کے کسی قدر تفصیلی حالات کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب زحمت فرما کر آگاہ فرمائیں تو میں ان کا شکر گزار رہوں گا۔

فیض آباد کے اسکول اور اردو

ضلع فیض آباد کے زیادہ تر سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ زیادہ تر مضافات کے جونیر ہائی اسکول اور پرائمری اسکول ڈسٹرکٹ بورڈ سے متعلق ہیں۔ ضلع بورڈ کے زیر نگرانی ان اسکولوں کیلئے ٹیچروں کی تقرری ہوتی ہے۔ لسانی فارمولا کے نفاذ کے بعد ہمیں توقع تھی کہ ایسے تمام جونیر ہائی اسکولوں میں اردو اساتذہ رکھے جائیں گے جہاں مقررہ تعداد میں اردو پڑھنے والے طلبا موجود ہیں گے لیکن حالت یہ ہے کہ ضلع کے بیسیوں جونیر ہائی اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبا موجود ہیں مگر ان کیلئے اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ طلبا کے سرپرست مطالبہ کرتے ہیں۔ بورڈ کو درخواستیں بھیجتے ہیں مگر ان کی درخواستوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

یہ تو ضلع فیض آباد کے سرکاری اسکولوں کی حالت ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ ٹانڈہ میں لڑکیوں کا ایک قومی آریہ کنیا انٹر کالج ہے۔ اس کالج میں اردو پڑھنے کی خواہشمند طالبات کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے لیکن ان طالبات کے مسلسل مطالبات کے باوجود کالج میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ گزشتہ سال مقامی انجمن ترقی اردو نے کالج میں پڑھنے والی اکتالیس طالبات کے سرپرستوں کی درخواستیں کالج مذکور کی پرنسپل کو پیش کی تھیں جن میں اردو تعلیم کے لیے علیحدہ ٹیچر فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں انجمن کا وفد پرنسپل صاحبہ سے دو مرتبہ ملاقات بھی کر چکا ہے۔ گزشتہ سال اردو پڑھانے کیلئے ایک ٹیچر کا تقرر کیا گیا تھا لیکن امسال پتہ چلا کہ کالج میں [illegible] کیلئے کوئی اردو ٹیچر نہیں ہے۔ واضح رہے کہ کالج میں پرائمری اور جونیر سیکشن بھی ہیں۔

یہی حال بی۔ این ڈگری کالج ٹانڈہ کا ہے جہاں ۶۳-۶۲ء تک اردو تعلیم کا انتظام تھا لیکن ٹیچر کی کمزوری کا عذر پیش کرتے ہوئے جولائی ۶۳ء سے اردو کو [illegible] سیکشن سے ختم کر دیا۔ اس سلسلہ میں کالج کے اردو پڑھنے والے طلبا نے دستخطی [illegible] تعلیم کے ذمہ داروں اور گورکھپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر [illegible] مقامی انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھی پرنسپل صاحب کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کرتے ہوئے ان سے اس اقدام سے باز رہنے کی درخواست کی گئی مگر ان تمام باتوں کا صرف ایک نتیجہ نکلا کہ بی۔ این ڈگری کالج سے اردو ختم کر دی گئی۔

اردو کے ساتھ اس قسم کی ناانصافی پورے ضلعے میں ہو رہی ہے اور ایک قومی زبان کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے۔ ہم اپنے ضلع کی یہ صورت حال پیش کر کے اردو دوستوں کو صحیح صورت حال سے باخبر کرنا چاہتے ہیں کہ اردو دوست ان حالات کو بدل سکتے ہیں۔ ضرورت صرف عمل اور مسلسل عمل کی ہے۔ (انعام انصاری۔ جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹانڈہ، فیض آباد)

فارم ۱۷
دیکھو رول ۸
اخبار ہماری زبان
علی گڑھ

۱۔ مقام اشاعت	سلطان جہاں منزل، علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت	ہفتہ وار
۳۔ نام پرنٹر	ضمیر الدین قریشی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	مسلم ایجوکیشنل پریس، کچہری، اسماعیلان علی گڑھ
۴۔ نام پبلشر	نذیر حسن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ
۵۔ نام ایڈیٹر	پروفیسر آل احمد سرور
قومیت	ہندوستانی
پتہ	شبلی روڈ، علی گڑھ
۶۔ نام و پتہ مالک اخبار	انجمن ترقی اردو ہند، سلطان جہاں منزل علی گڑھ

میں نذیر حسن تصدیق کرتا ہوں کہ معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۶۵ء
نذیر حسن

مراسلات

لقمان، بقراط اور جالینوس

لقمان :-

لقمان اور ایسپ (AESOP) الگ الگ دو شخصیتیں ہیں۔ ایسپ کا زمانۂ حیات ۶۲۰ – ۵۶۰ قبل مسیح مانا جاتا ہے۔ پلوتارک (پہلی صدی بعد مسیح) نے لکھا ہے کہ وہ نوجوانی کے عالم میں غلام بنا کر … لایا گیا تھا۔ وہ حکایتیں جو اس سے منسوب کی جاتی ہیں وہ اس کی باقاعدہ لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ عوام کو سنائی ہوئی ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ کہانیاں جو آج کل ایسپ سے منسوب کی جاتی ہیں وہ سب اس کی نہیں ہیں، اکثر سینہ بہ سینہ چلے آ رہے قصوں کے مجموعے پر مبنی ہیں۔ پہلی صدی بعد مسیح میں فیدرس نے اپنی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ ان کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور یہی بعد میں ایسپ کے قصوں کے عنوان سے تمام دنیا میں پھیل گئیں۔ ان میں سے اکثر قصے مشرق بالخصوص ہندوستان کے قدیم ادب سے ماخوذ ہیں۔

لقمان کی حیات کے بارے میں ہم تاریکی میں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ قبل اسلام کی ایک سراپا دانش و حکمت شخصیت ہے۔ قرآن کریم میں ایک سورہ آپ کے نام پر ہے۔ بعض آپ کو قوم عاد سے منسوب کرتے ہیں۔ عقل کے علاوہ آپ درازیٔ عمر کے لیے بھی معروف تھے۔ طب سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جو مثل مشہور ہے کہ وہمی کی دوا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں، اس میں بھی آپ کے حکیم یعنی فلسفی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک بڑا فلسفی بھی وہم کا علاج کرنے سے اسی طرح عاجز ہے کہ وہ چاہے کتنے ہی دلائل پیش کرے وہ ایک وہمی شخص کے اوہام دور کرنے میں سودمند نہیں ہوتے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں ایسپ کی کہانیاں عالم اسلام میں پھیلیں اور بعض بتدریج اسلامی ادب کا جزو بن گئیں۔ مثلاً تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور صوفی مولانا رومی کی مثنوی (دفتر سوم) میں "… شغال در خم رنگ" کا قصہ ہے جو بظاہر ایسپ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں ایسپ کی کچھ کہانیاں عرب ممالک میں لقمان کے نام سے مشہور ہونے لگیں، اور لقمان بتدریج عربوں کے ایسپ بن بیٹھے۔ ایسپ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ غلام تھے۔ اب لقمان کو بھی غلام سمجھا جانے لگا، … پیش کیا جانے لگا۔ ثعلبی نے قصص الانبیاء میں، ابو الفتوح نے اپنی تفسیر (جلد چہارم) میں، رومی نے اپنی مثنوی (دفتر اول) میں لقمان کو غلام بنا کر اس کے بارے میں ایک قصہ بھی لکھا ہے وہ یہ ہے کہ لقمان کے ساتھی غلام میوے کھا لیتے تھے اور آقا سے کہتے تھے کہ لقمان کھا لیتا ہے۔ لقمان نے آقا سے کہا آپ سب کو گرم پانی پلائیں … دیکھیں کہ استفراغ کی حالت میں کس کے منہ سے کیا نکلتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ سب کے منہ سے میوے نکلے لیکن لقمان کے منہ سے صرف پانی نکلا۔

بقراط :-

بقراط یعنی یونان کا مشہور حکیم Hippocrates پانچویں صدی قبل مسیح کی شخصیت ہے، اور بابائے طب مانا جاتا ہے۔ اس کے حقیقی حالات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ اس سے منسوب کتابوں کا مجموعہ Hippocratic collection کے نام سے مشہور ہے۔ ان میں سے بہت ہی کم واقعی اس کی ہیں۔ بہر حال یہ مشہور ہے کہ اس نے سب سے پہلے طب کو فلسفہ سے الگ کرکے ایک مستقل حیثیت دی۔ مسلمان اس کے بڑے شیدائی رہے ہیں۔ ان کا طب یونانی اسی کی کتابوں اور جالینوس کی شرحوں پر مبنی ہے۔ نظامی عروضی نے چہار مقالہ (مقالۂ چہارم – طب) میں "فصول بقراط" کا ذکر کیا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ حنین بن اسحٰق (۱۹۴ – ۲۶۰ھ) نے "الفصول الابقراطیة فی الاصول الطبیة" کے نام سے کیا تھا۔ ثابت بن قرہ نے بھی بقراط کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ بقراط جالینوس کا شاگرد تھا۔ جالینوس تو اس کے بہت بعد آتا ہے۔ اور اس کی تصانیف کا شارح ہے۔ اگر کسی داستان گو نے ان دونوں کے سفر کے قصے لکھے ہیں تو یہ محض اس کے تخیل کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ بقراط کا سقراط سے کوئی تعلق نہیں۔

جالینوس :-

جالینوس (Galen) بقراط کی کتابوں کا مشہور شارح بھی بڑے پایہ کا طبیب اور فلسفی مانا جاتا ہے۔ تاریخ انتقال تقریباً ۲۰۰ قبل مسیح۔ اس کی بھی کتابوں کا یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوا ہے۔ چہار مقالہ میں "ستہ عشر جالینوس" کا ذکر ملتا ہے۔ (مقالۂ چہارم) خواجہ نصیر الدین طوسی نے "اخلاق ناصری" (مقالۂ اول، قسم دوم، فصل اول) میں [illegible] فلسفیانہ نظریات کا ذکر کیا ہے۔ مولانا رومی نے ایک مقام پر (شعر نمبر ۱) اس کی طبیب کی حیثیت اور دوسرے مقام پر (شعر نمبر ۲) بحیثیت فلسفی کی حیثیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۔ ای دوای نخوت و ناموس ما — ای تو افلاطون و جالینوس ما (دفتر اول)

۲۔ آنچنان کہ گفت جالینوس راد — از ہوای این جہان و از مراد (دفتر سوم)

[… سید نعیم الدین، ناگپور]

'طائفۂ دزدانِ ادب'

'طائفۂ دزدانِ ادب' کے عنوان سے جناب میر حسن صاحب نورانی کا مضمون "عصر حاضر" میں "علم و فن" کی ترقی کا کڑی نظر سے درست جائزہ ہے۔ ہمارے "تحقیقی مقالوں" کی نوعیت، "عمومیت اور سوقیت" پر بصیرت افروز اور "عبرت خیز" نظر ڈالی گئی ہے۔ اس قبیل کی تمام کاوشوں اور کوششوں کے "حاصل سرمایہ" پر "اجمالی اشارات" میں تبصرہ ہے مگر ان "اجمالی اشارات" کے دبیز پردوں سے "شاہدِ معنی" کی جھلکیاں صاف اور واضح نظر آتی ہیں۔

"طائفۂ دزدانِ ادب" کو نورانی صاحب نے دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ راقم کے علم میں ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ ممکن ہے وہ گروہ ان دو گروہوں میں چھپ گیا ہو۔

اس تیسرے گروہ کے "غلط نما" بالکل بڑے "تن آسان" اور "کوتاہ قلم" ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے تحقیقی مقالے، مضامین، غزلیں، نظمیں وغیرہ تصنیف کراتے اور اپنے نام سے علمی و ادبی دنیا میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ اسے قسمت کی یاوری کہیے، کہ ڈگریوں کے علاوہ شہرت اور مناصب بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ وہ ٹھاٹ سے کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ دوسروں کے دماغ کی پیداوار کو غلط طریقہ سے نقل کرتے اور غلط لب و لہجے سے پڑھتے ہیں۔ اور حیرت کا مقام ہے کہ بڑے بڑے فاضل ان مقالات کو سنتے اور سر دھنتے ہیں۔

شعر ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ایسے "دزدانِ ساہوکار" مقالہ نگار (بقول "آزاد") "مراد کے بہلوں میں بیٹھے ترقیوں کے آسمان کی سیر کرتے پھرتے ہیں۔"

جناب نورانی صاحب نے لکھا ہے "کہ کئی کئی جگہ ایک ہی عنوان پر کئی اسکالر کام کر رہے ہیں۔ اور ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔" اور اگر خبر ہو جاتی ہے تو پھر دوڑ شروع ہو جاتی ہر شخص "تقدم زمانی" حاصل کرنے کے لیے "تیز تر" دوڑتا ہے اور اس طرح فن کی گہرائی اور گیرائی اور "ذوق" کا خاتمہ ہو جاتا ہے تحقیقی مقالہ یونیورسٹی کی مرحلوں سے آسانی سے گذر کر پریس کے سخت پتھروں کے ستم سہتا ہوا ایک طویل غلط نامہ کے ساتھ منظر عام پر آ جاتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے خیال کے مطابق پی۔ ایچ۔ ڈی۔ Ph.D کا مطلب یہ کہ کام کرنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ مگر دیکھا یہ جا رہا ہے کہ اس "کامرانی" کے بعد یہ "سلیقہ" ختم ہو جاتا ہے۔

(صہبا)

لالہ لاجپت رائے کا مولد

'ہماری زبان' بابت یکم فروری ۱۹۶۵ء کے اداریہ میں لکھا گیا ہے۔

"۔۔ لالہ لاجپت رائے ۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو لدھیانہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔۔"

اداریہ کے اس فقرے سے تسامح کی گنجائش ہے جس کی توضیح کے لیے گزارش ہے کہ

لالہ جی اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے تھے۔ اس موضع کا نام "ڈھوڈیکے" ہے۔ اور یہ گاؤں ضلع لدھیانہ نہیں بلکہ ضلع فیروزپور میں واقع ہے۔ جہاں آپ کی یادگار قائم کی گئی ہے جس مکان میں آپ کا جنم ہوا تھا اس جگہ ایک لائبریری تعمیر کی جا رہی ہے۔ گذشتہ روز لالہ جی کے جنم دن پر اسی یادگار کا افتتاح کرنے وزیر اعظم شری شاستری جی اس گاؤں میں تشریف لے گئے تھے۔ لالہ جی کے والد منشی رادھا کشن جی جگراؤں ضلع لدھیانہ کے باشندے تھے غالباً اسی واسطے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔

(مسعود تنویر)

جامعہ اردو کے امتحانات اور دلی یونیورسٹی

۸ جنوری ۱۹۶۵ء کے ہماری زبان میں "امتحانات جامعہ اردو کی منظوری" کے عنوان سے جو خبر شائع ہوئی ہے اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے براہ کرم یہ چند سطور ہماری زبان کی کسی قریبی اشاعت میں شائع فرمائیں۔

جامعہ اردو کے امتحانات کو دلی یونیورسٹی نے صرف اس اعتبار سے تسلیم کیا ہے کہ ہندی کے پرچار، عربی کے مولوی فاضل اور پنجابی کے گیانی امتحانات کے ساتھ اسے بھی داخلے کے لیے منظور کر لیا گیا ہے اگر کسی طالب علم کے بی۔ اے میں مجموعی نمبر چالیس فی صدی ہوں اور بی۔ اے اردو میں یا جامعہ اردو کے ادیب کامل میں پچاس فی صدی نمبر ہوں تو اس کا داخلہ اردو ایم۔ اے میں ہو سکتا ہے۔

(خواجہ احمد فاروقی۔ صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہماری زبان مورخہ ۸ جنوری ۱۹۶۵ء میں ایک خبر بعنوان "روداد جلسہ اساتذہ اردو دلی یونیورسٹی" شائع ہوئی ہے۔ اس خبر کے عنوان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انجمن دلی یونیورسٹی کے اردو اساتذہ کی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دلی کے ان اساتذہ پر مشتمل ہے جو دلی کے مڈل اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں کام کرتے ہیں۔

براہ کرم یہ چند سطور غلط فہمی کے ازالے کے لیے شائع کر دیں۔

(خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی)

ایک شعر کی تحقیق کے سلسلے میں

میں نے "ہماری زبان" کے ذریعہ یہ استفسار کیا یہ شعر کس کا ہے:۔

اگر بخت نہ ہے قسمت نہ بخت تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

اب یکم فروری کے شمارے میں مس عطیہ شیخ کا جواب چھپا ہے کہ آتش کا ہے، پھر فرماتی ہیں کہ یکم فروری ۱۹۷۳ء کے ہماری زبان میں چھپا تھا کہ اصغر شاگرد آتش کا ہے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے کہ میں نے شتیلا سہائے راز کانپوری کی کتاب "گلہائے شگفتہ" میں صفوا پر پڑھا ہے کہ آتش کا ہے۔ میں اس سے اور الجھ گیا۔ گلہائے شگفتہ آتش نے نہیں لکھی تھی اور دیوان آتش شتیلا سہائے راز کانپوری نے تصنیف نہیں کیا تھا۔ اگر خواجہ حیدر علی آتش کا ہے تو ان کے دیوان میں ہونا چاہیے اور اسی کا حوالہ دیا جانا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ آتش کے دیوان دوم میں اس زمین میں ایک غزل موجود ہے مگر مذکورہ شعر اس میں نہیں ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ "گلدستہ حفیظ اللہ خاں" ایک انتخاب غزلیات ہے جو نولکشور نے چھاپا تھا اس میں مکمل غزل مونس لکھنوی کی موجود ہے اور اسی میں یہ شعر بھی ہے۔ دیوان مونس نہیں چھپا، ورنہ اس کا حوالہ دیا جاتا۔

ایک سوال اور پیدا ہو گیا یہ عطیہ (ہونے سے) عربی الفس تو ہے نہیں، کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؛ عربی میں تو ایک لفظ عطیفہ (رخنے سے) "نازک عورت" کے معنوں میں ہے دوسرا عتیقہ (رتے) سے آزاد عورت کے لیے۔

(نثار احمد فاروقی دہلی ۶)

"یہ شعر کس کے ہیں"

اس عنوان کے تحت ۸ فروری کے "ہماری زبان" میں جو تین شعر چھپے ہیں ان میں سے ایک یوں درج ہے۔

میں خوش ہوں آج مسجد ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

گزارش ہے کہ صحیح شعر یوں ہے

جی خوش ہوا ہے مسجد ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

اور یہ شعر حفیظ جالندھری کا ہے

(جگن ناتھ آزاد)

ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا